AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

The Limits of Human Knowledge and Divine Will: An Intellectual and Analytical Study of Surah Al-Kahf

علمِ بشری کی حدود اور مشیتِ الٰہی: سورہ کہف کی آیات 60 تا 82 (قصۂ حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام) کا فکری و تجزیاتی مطالعہ

Muhammed Afzal Khan PhD Scholar
Department of Islamic Studies, University of Peshawar Khyber Pakhtunkhwa, Pakistan
Email: muhammadafzalkhan382@gmail.com

Abstract

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا

"Then they found one of Our servants, whom We had given mercy from Us and had taught him knowledge from Our own presence."[1]

The boundaries of human intellect frequently collide with the unfathomable depths of Divine Will. Human beings evaluate the world through observable phenomena, constructing logical frameworks to understand existence. The narrative of Prophet Musa and Khidr dismantles this purely empirical worldview, exposing the fragile limits of human epistemology. A revered messenger, despite his exalted spiritual status, undertakes a grueling journey to seek a form of knowledge that transcends the physical senses. This pursuit illuminates the stark contrast between apparent reality and hidden divine wisdom. Drawing upon deductive and epistemological methods, this study explores the theological and socio-psychological dimensions of their encounter. The interaction between teacher and student in this context redefines the ethics of seeking knowledge, demanding absolute patience in the face of the unknown. Three seemingly paradoxical events—damaging a ship, taking a young life, and repairing a wall for ungrateful hosts—serve as profound answers to the modern philosophical dilemma of theodicy. These occurrences challenge the modern atheistic critique of evil, proving that isolated tragedies conceal a broader, merciful divine strategy. The research navigates through these complex themes, bridging classical exegesis with contemporary philosophical discourse. Accepting the limitations of human logic brings psychological tranquility, enabling believers to navigate a chaotic world with unwavering faith in the unseen divine orchestration.

Keywords : Divine Will, Human Epistemology, Theodicy, Surah Al-Kahf, Prophet Musa, Khidr, Islamic Philosophy.

تعارف

[1] Al-Kahf, 18:65

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

انسان نے جب سے اس کائنات میں آنکھ کھولی ہے، وہ اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے مظاہر کو سمجھنے کے لیے حواسِ خمسہ اور عقل کا سہارا لیتا آیا ہے۔ انسانی عقل ہر واقعے کو علت اور معلول کے ترازو پر تولتی ہے۔ جو چیز اس منطقی دائرے میں سما جائے، عقل اسے تسلیم کر لیتی ہے، اور جو بات اسباب کے پردے سے باہر ہو، انسان اسے مسترد کرنے یا اس پر تشکیک کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ کائنات کا نظام صرف ان مادی اسباب تک محدود نہیں ہے جو انسانی آنکھ کو نظر آتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اس دنیا کو چلانے کے لیے علمِ ظاہر (شریعت) کے ساتھ ساتھ ایک ایسا مخفی نظام بھی قائم کر رکھا ہے جسے علمِ باطن یا تکوینی نظام کہا جاتا ہے۔

انسانی علم کی اس بے بسی اور محدودیت کو قرآنِ مجید نے ایک آفاقی اصول کی صورت میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾

ترجمہ: "اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔"[2]

جدید ذہن ہر چیز کو سائنس اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ یہیں سے وہ فکری المیہ جنم لیتا ہے جہاں جدید انسان دنیا میں ہونے والے سانحات، قدرتی آفات اور بظاہر غیر منصفانہ واقعات پر خدا کی ذات پر معترض ہوتا ہے۔ فرانسیسی ریاضی دان اور فلسفی بلیز پاسکل نے انسانی عقل کی اس بے بسی اور محدودیت کا اعتراف اپنے مشہور مقالے میں کیا ہے:

"The supreme achievement of reason is to realize that there is a limit to reason".

ترجمہ: "عقل کی سب سے بڑی کامیابی اس بات کا ادراک کر لینا ہے کہ عقل کی ایک حد ہے۔"[3]

سورہ کہف میں بیان کردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ اسی فکری خلیج کو پاٹنے کا نام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت اور علمِ ظاہر کے سب سے بڑے امین تھے، جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینی اور مخفی علم کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ ان دونوں ہستیوں کا ملاپ دراصل انسانی منطق اور الٰہی حکمت کے مابین ایک علمیاتی مکالمہ ہے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے عقل کی ان حد بندیوں اور عشق یا علمِ الٰہی کی وسعت کو اپنے کلام میں بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں[4]

اس مطالعے کا بنیادی مقصد جدید ذہن کے ان شکوک و شبہات کو دور کرنا ہے جو وہ کائنات میں موجود ظاہری تضادات کو دیکھ کر پیدا کرتا ہے۔ جہاں انسانی عقل دم توڑ دیتی ہے، باری تعالیٰ کی منشا اور اس کی پوشیدہ حکمتیں وہیں سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں۔

---

[2] الاسراء، 17:85، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[3] Pascal, Blaise, Pensées, New York: Penguin Classics, 1995, p. 84

[4] اقبال، محمد، بالِ جبریل (کلیاتِ اقبال)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2005ء، ص: 341

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مجمع البحرین کا سفر (آیت 60 کا تجزیاتی مطالعہ)

جستجو انسانی روح کی وہ پیاس ہے جو کبھی نہیں بجھتی، اور جب یہ پیاس علمِ الٰہی کے حصول کے لیے ہو، تو انسان زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ایک جلیل القدر اولوالعزم پیغمبر تھے۔ ان کے پاس تورات کی صورت میں شریعت کا مکمل علم موجود تھا، مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ دنیا کے ایک گوشے میں ایک ایسا بندہ موجود ہے جسے قدرتِ خداوندی نے ایک مختلف علم عطا کر رکھا ہے، تو انہوں نے اپنے سفر کے ارادے کا اعلان ان تاریخی الفاظ میں کیا:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا﴾

ترجمہ: "اور جب موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ جب تک دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ نہ پہنچ جاؤں، میں چلنے سے باز نہیں آؤں گا خواہ مجھے سالہا سال چلتے گزر جائیں۔"[5]

یہ قرآنی اعلان علم کی راہ میں کی جانے والی ہجرت اور مشقت کا ایک استعارہ ہے۔ ایک جلیل القدر نبی کا یہ کہنا کہ وہ سالہا سال (حُقُبًا) تک چلتے رہیں گے، اس بات کی دلیل ہے کہ علم کا حصول گھر بیٹھے آرام و آسائش کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا۔ امام فخر الدین الرازی اس مقام کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان علم میں جس قدر بھی کمال کو پہنچ جائے، وہ اس بات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے صاحبِ علم سے مزید استفادہ کرے [6]۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے علم کی خاطر سفر کرنے والوں کے اس مقام کو نہایت خوبصورت اور پُر وقار انداز میں بیان فرمایا ہے:

﴿مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ﴾

ترجمہ: "جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔"[7]

یہاں "مجمع البحرین" (دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ) محض ایک جغرافیائی مقام نہیں ہے۔ صوفیائے کرام اور اہلِ معرفت کے نزدیک یہ دراصل علمِ ظاہر (شریعت) اور علمِ باطن (طریقت / تکوین) کے سنگم کا استعارہ ہے۔ جب تک یہ دونوں علوم کسی ایک مقام پر جمع نہ ہوں، کائنات کی مکمل حقیقت آشکار نہیں ہوتی۔ فارسی ادب کے مایہ ناز صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی نے علم کی اس کٹھن جستجو اور باطنی سفر کی تڑپ کو اپنی مثنوی میں یوں بیان کیا ہے:

آب کم جو تشنگی آور بہ دست
تا بجوشد آب از بالا و پست

---

[5] الکہف، 18:60، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[6] الرازی، فخر الدین، مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1420ھ، ج:21، ص:142

[7] مسلم، مسلم بن الحجاج، الصحیح، کتاب الذکر والدعاء، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1991ء، حدیث نمبر:2699، ج:4، ص:2074

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ترجمہ: "پانی کی تلاش کم کر، اپنے اندر پیاس پیدا کر، تاکہ پانی خود بخود تیرے لیے اوپر اور نیچے سے ابل پڑے۔"[8]

قرآن کریم کا نظامِ تعلیم اور تصور آداب (آیت 66 کا تجزیاتی مطالعہ)

جب یہ طویل اور تھکا دینے والا سفر اپنی منزل پر پہنچا، تو دو عظیم ہستیوں کی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات جدید تعلیمی نظام کے لیے استاد اور شاگرد کے رویوں کی ایک مکمل اور بے عیب اخلاقی دستاویز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو بنی اسرائیل کے نجات دہندہ اور صاحبِ کتاب پیغمبر تھے، جب حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے آئے تو انہوں نے اپنی نبوت یا سماجی مرتبے کا کوئی رعب قائم نہیں کیا، بلکہ ایک طالبِ علم کی حیثیت سے انتہائی عاجزی کے ساتھ درخواست کی:

﴿قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾

ترجمہ: "موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو بھلائی کی باتیں آپ کو سکھائی گئی ہیں کیا اس شرط پر میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے بھی سکھائیں۔"[9]

یہ جملہ آدابِ تعلیم و تعلم کی معراج ہے۔ اس میں اجازت مانگنے کا انداز، استاد کے علم کا اعتراف، اور اپنی کم مائیگی کا اظہار پوشیدہ ہے۔ حافظ عماد الدین ابنِ کثیر اس مقام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمال درجے کی شائستگی اختیار کی اور خضر علیہ السلام پر اپنے اتباع کو مسلط نہیں کیا، بلکہ ایک نرم سوال کے ذریعے اپنے آپ کو ان کے ماتحت کر دیا[10]۔

حجۃ الاسلام امام غزالی نے اپنے شاہکار "احیاء علوم الدین" میں شاگرد کے لیے جو آداب مقرر کیے ہیں، ان کی روح اسی قرآنی مکالمے سے ماخوذ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علم اس وقت تک سینے میں داخل نہیں ہوتا جب تک طالبِ علم اپنے استاد کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کر دے جس طرح ایک بیمار شخص خود کو ایک شفیق طبیب کے حوالے کر دیتا ہے[11]۔

مشہور فارسی شاعر سعدی شیرازی نے بھی استاد کے سامنے طالبِ علم کی اس عاجزی اور انکساری کو حصولِ علم کی اولین شرط قرار دیا ہے:

تکبر کُند مردِ دانش تہی
کہ پُر خوشہ بیں سر نہد بر زمیں

ترجمہ: "خالی ذہن والا انسان ہی تکبر کرتا ہے، کیا تو نہیں دیکھتا کہ اناج سے بھری ہوئی بالی ہمیشہ اپنا سر زمین کی طرف جھکا دیتی ہے۔"[12]

---

[8] رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، دفتر سوم، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ، ص:215

[9] الکہف، 18:66، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[10] ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، ریاض: دار طیبہ، 1999ء، ج:5، ص:177

[11] الغزالی، ابو حامد، احیاء علوم الدین، بیروت: دار المعرفہ، 1982ء، ج: 1، ص:49

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جدید تعلیمی نظام جس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک تجارتی اور مشینی تعلق بن کر رہ گیا ہے، وہاں یہ قرآنی ماڈل ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقی علم، جسے قرآن "رُشْدًا" (رہنمائی) کہتا ہے، کبھی بھی عاجزی، ادب اور قلبی احترام کے بغیر منتقل نہیں ہوتا۔ علم کو پیسوں سے خریدا جا سکتا ہے مگر حکمت اور رہنمائی استاد کی باطنی نگاہ سے ہی عطا ہوتی ہے۔

انسانی منطق اور علمِ لدنی (آیات 67 تا 70 کا تجزیاتی مطالعہ)

مجمع البحرین کے اس پر سکون ساحل پر دو عظیم ہستیوں کی ملاقات محض دو افراد کا ملنا نہیں تھا، بلکہ یہ انسانی تاریخ میں دو مختلف علمیاتی نظاموں کا سب سے بڑا ٹکراؤ تھا۔ ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جو شریعت، قانون، علت و معلول اور انسانی منطق کے سب سے بڑے امین تھے۔ ان کا علم ظاہری اسباب اور عدل و انصاف کے ٹھوس اصولوں پر قائم تھا۔ دوسری جانب حضرت خضر علیہ السلام تھے، جنہیں قدرتِ خداوندی نے کائنات کے اس پس پردہ نظام کا نگران بنایا تھا جسے علمِ باطن یا علمِ تکوین کہا جاتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انتہائی شائستگی کے ساتھ ان کی شاگردی اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو حضرت خضر کا پہلا جواب انسانی نفسیات اور انسانی علم کی محدودیت پر ایک ایسی کاری ضرب تھا جس نے منطق کے تمام بتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

قرآنِ مجید اس غیر متوقع اور دوٹوک جواب کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

﴿قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾

ترجمہ: "انہوں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔"[13]

یہاں ایک جلیل القدر پیغمبر کی قوتِ ارادی یا ان کے عزم پر شک نہیں کیا جا رہا تھا۔ حضرت خضر دراصل اس بنیادی انسانی جبلت کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ انسان کا ذہن اس وقت تک سکون نہیں پا سکتا جب تک وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کی منطقی وجہ نہ جان لے۔ جب انسان کو کسی عمل کا ظاہری سبب نظر نہیں آتا، تو اس کے اندر ایک شدید نفسیاتی اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہ اضطراب اسے سوال کرنے، بے چین ہونے اور بالآخر بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

امام ابو حامد الغزالی نے علم کی ان دو مختلف جہتوں کو اپنی شہرہ آفاق تصنیف میں انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علمِ کسبی (حاصل کیا گیا علم) حواس اور عقل کا محتاج ہوتا ہے، جبکہ علمِ لدنی وہ نور ہے جو بغیر کسی واسطے کے براہِ راست منشائے الٰہی سے قلب میں اترتا ہے۔ جب علمِ کسبی کے پاس کسی واقعے کی ظاہری توجیہ موجود نہ ہو، تو وہ علمِ لدنی کے فیصلوں پر بے تاب ہو کر تنقید شروع کر دیتا ہے[14]۔

---

[12] سعدی، مصلح الدین، گلستانِ سعدی، تہران: انتشاراتِ قفنوس، 1998ء، ص:134

[13] الکہف، 18:67، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[14] الغزالی، ابو حامد، احیاء علوم الدین، بیروت: دار المعرفہ، 1982ء، ج:3، ص:23

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اس علمِ لدنی کی ماہیت اور انسانی منطق کی بے بسی کو مولانا جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں ایک ابدی حقیقت کے طور پر یوں رقم کیا ہے:

دفترِ صوفی سواد و حرف نیست
جز دل اسپید ہمچون برف نیست
زادِ دانشمند آثار قلم
زادِ صوفی چیست آثار قدم

ترجمہ: "صوفی (اہلِ باطن) کا دفتر سیاہی اور حروف کا محتاج نہیں ہوتا، اس کا سرمایہ تو برف کی طرح سفید اور اجلا دل ہوتا ہے۔ ایک ظاہری عالم کا زادِ راہ قلم کے نشانات ہیں، جبکہ اہلِ باطن کا زادِ راہ رضائے الٰہی کے قدموں کے نشانات ہیں۔"[15]

حضرت خضر علیہ السلام نے اسی اضطراب اور انسانی فطرت کی بے چینی کی نفسیاتی وجہ بیان کرتے ہوئے اگلی ہی آیت میں ایک ایسا آفاقی اصول وضع کر دیا جو آج کی جدید نفسیات کا بھی ایک بنیادی نظریہ ہے:

﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا﴾

ترجمہ: "اور جس بات کی آپ کو خبر ہی نہیں اس پر آپ کیونکر صبر کر سکتے ہیں۔"[16]

انسان نامعلوم سے خوفزدہ رہتا ہے۔ جب اس کے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جو بظاہر ظلم، تخریب یا ناانصافی پر مبنی ہو اور اسے اس کے پسِ پردہ حقائق کا کوئی علم نہ ہو، تو وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسانی دماغ ایک پیش گوئی کرنے والی مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ جب معاملات اس کی پیش گوئی اور منطق کے دائرے سے باہر نکلنے لگتے ہیں، تو اس کے اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔

جرمن فلسفی اور ماہرِ علمیات امانوئل کانٹ نے انسانی عقل کی اس بے بسی اور حدود پر اپنی تنقیدی کتاب میں ایک انتہائی چشم کشا حقیقت بیان کی ہے، جو حضرت خضر کے اس فرمان کی ایک جدید فلسفیانہ تشریح معلوم ہوتی ہے:

"Human reason has this peculiar fate that in one species of its knowledge it is burdened by questions which, as prescribed by the very nature of reason itself, it is not able to ignore, but which, as transcending all its powers, it is also not able to answer".

ترجمہ: "انسانی عقل کی یہ کیسی عجیب تقدیر ہے کہ اپنے علم کے ایک خاص دائرے میں یہ ایسے سوالات کے بوجھ تلے دب جاتی ہے جنہیں عقل کی اپنی فطرت کے باعث نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا، لیکن چونکہ وہ سوالات اس کی تمام تر صلاحیتوں سے ماورا ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کے جوابات دینے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔"[17]

---

[15] رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، دفتر دوم، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ، ص:159

[16] الکہف، 18:68، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[17] Kant, Immanuel, Critique of Pure Reason, translated by Norman Kemp Smith, London: Macmillan, 1929, p. 7

یہی وہ بوجھ تھا جس کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام سفر کرنے والے تھے۔ ان کے سامنے بظاہر شریعت کی خلاف ورزی اور ظلم ہونے والا تھا، ان کی فطرت، جو حق کی بالادستی کے لیے بے چین رہتی تھی، انہیں خاموش رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی، مگر دوسری طرف وہ تکوینی حقائق ان کی بصارت اور منطق سے مکمل طور پر پوشیدہ تھے۔

اس شدید نفسیاتی دباؤ اور منطقی چیلنج کے باوجود، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب ایک طالبِ علم کے باطنی عزم اور الٰہی منشا پر توکل کی عظیم ترین مثال ہے۔ انہوں نے اپنی قوتِ ارادی پر غرور کرنے کے بجائے اپنا سارا معاملہ اللہ کی مشیئت کے سپرد کر دیا:

﴿قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا﴾

ترجمہ: "انہوں نے کہا کہ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔"[18]

یہاں "ان شاء اللہ" کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا صاحبِ علم و فضل کیوں نہ ہو، اس کا ارادہ اور اس کا صبر اللہ کی توفیق کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حافظ ابنِ کثیر اس مقام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے صبر کی بنیاد اپنی ذات پر نہیں رکھی، بلکہ انہوں نے اپنی بشری کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ کی مشیئت سے مدد طلب کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس سفر پر وہ نکل رہے ہیں وہاں ان کا علم نہیں بلکہ ان کا باطنی تسلیم و رضا کام آئے گا[19]۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس انسانی بے تابی اور نامعلوم حقیقت کو جاننے کی اس بے تابانہ جستجو کو نہایت محبت بھرے انداز میں یاد فرمایا ہے۔ انسان کی فطری کمزوری اور اس واقعے کے انجام پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

﴿يَرْحَمُ اللَّهُ مُوسَى، لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتَّى يُقَصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِ هِمَا﴾

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم فرمائے، ہماری تو یہ تمنا تھی کہ کاش وہ مزید صبر کرتے تاکہ ہمیں ان دونوں کے معاملات کے بارے میں مزید کچھ حالات سنائے جاتے۔"[20]

یہ حدیث مبارکہ اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہے کہ سوال کرنا، بے چین ہونا اور منطق تلاش کرنا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ شریعت ہمیں اس بات کا پابند بناتی ہے کہ جہاں ہم بظاہر کوئی ظلم یا بے ضابطگی دیکھیں، تو وہاں سوال اٹھائیں۔ لیکن علمِ تکوین کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے شرط بالکل مختلف ہے۔ حضرت خضر نے اس طویل سفر کا آغاز کرنے سے قبل ایک ایسی کڑی اور حتمی شرط عائد کر دی جس نے انسانی عقل کو مکمل طور پر معطل ہونے کا حکم دیا:

﴿قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾

---

[18] الکہف، 18:69، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[19] ابن کثیر، عماد الدین، تفسیر القرآن العظیم، ریاض: دار طیبہ، 1999ء، ج:5، ص:178

[20] البخاری، محمد بن اسماعیل، الصحیح، کتاب احادیث الانبیاء، بیروت: دار طوق النجاۃ، 1422ھ، حدیث نمبر: 3401، ج:4، ص:154

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ترجمہ: "خضر نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کی بابت سوال نہ کیجئے گا جب تک میں خود اس کا ذکر آپ سے نہ کروں۔"[21]

جدید تعلیمی نظاموں میں سوال کرنا سیکھنے کی بنیادی شرط سمجھی جاتی ہے، مگر تکوینی علوم کی درسگاہ میں سرِ تسلیم خم کر دینا اور خاموشی اختیار کر لینا فہم و فراست کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ جب ایک مصور کینوس پر بے ترتیبی سے رنگ بکھیر رہا ہوتا ہے، تو دیکھنے والے کو وہ تمام رنگ بے ہنگم اور بے مقصد نظر آتے ہیں۔ اگر دیکھنے والا اس عمل کے دوران ہی اعتراض شروع کر دے، تو وہ کبھی اس شاہکار کی حتمی صورت نہیں دیکھ پاتا۔ کائنات کا نظام بھی ایک ایسا ہی کینوس ہے جس پر باری تعالیٰ اپنی مشیئت کے رنگ بکھیرتا ہے۔ انسانی عقل ان رنگوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتی جب تک کہ وہ مکمل تصویر سامنے نہ آ جائے۔

مرزا اسد اللہ خان غالب نے کائنات کے ان بکھرے ہوئے رنگوں، انسانی سمجھ کی محدودیت، اور پردۂ غیب میں چھپے ہوئے حقائق کو اپنے ایک لاثانی شعر میں جس طرح سمویا ہے، وہ حضرت خضر کی اس شرط کی عین ادبی ترجمانی معلوم ہوتا ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا[22]

آج کے دور کا انسان اپنی ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے زعم میں ہر چیز کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ مستقبل کا ڈیٹا جمع کرتا ہے، انشورنس پالیسیاں بناتا ہے، اور رزق کے خوف سے معاشی پیش بندیاں کرتا ہے۔ لیکن جب اس کے تمام تر منطقی اور سائنسی حصار ٹوٹتے ہیں، کوئی اچانک بیماری آگھیرتی ہے، یا کوئی قدرتی آفت اس کے منصوبوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، تو وہ ڈپریشن اور شدید نفسیاتی خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ اضطراب اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ علمِ ظاہر کے خول میں قید ہے، اور اس کے پاس وہ 'صبر' نہیں ہے جس کا مطالبہ حضرت خضر نے کیا تھا۔

شیخ الاسلام ابنِ قیم الجوزیہ قلبِ انسانی کے اس اضطراب کے علاج کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان کا دل اس وقت تک قرار نہیں پا سکتا جب تک وہ اس حقیقت پر کامل ایمان نہ لے آئے کہ کائنات کے خالق کی حکمت اور اس کے فیصلے انسان کے محدود فہم سے کہیں بلند اور برتر ہیں، اور جو کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ بھی کسی نہ کسی عظیم تر بھلائی کا حصہ ہے[23]۔

عقل کی آخری سرحد دراصل تسلیم و رضا کی پہلی سیڑھی ہے۔ جب انسان اپنی منطق کے ہتھیار ڈال کر قدرتِ خداوندی کے بے آواز فیصلوں پر خاموشی اور صبر اختیار کر لیتا ہے، تو اس پر حکمت اور علمِ لدنی کے وہ دروازے کھلتے ہیں جو دنیا کے کسی بھی ظاہری مدرسے میں نہیں سکھائے جاتے۔

---

[21] الکہف، 18:70، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[22] غالب، اسد اللہ خان، دیوانِ غالب، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 2008ء، ص:112

[23] ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، بیروت: دار الکتب العربی، 1996ء، ج:2، ص:215

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

حضرت خضر علیہ السلام کے ظاہری تخریب میں پوشیدہ حکمتیں (آیات 71 تا 82 کا تجزیاتی مطالعہ)

مجمع البحرین کے مقام پر طے پانے والی شرط کے بعد اس پر اسرار اور صبر آزما سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ سفر دراصل انسانی تاریخ میں علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان ایک چلتی پھرتی تجربہ گاہ تھا۔ انسانی عقل ہمیشہ ان دیکھے حقائق کا تجزیہ ان معلومات کی بنیاد پر کرتی ہے جو حواسِ خمسہ اسے فراہم کرتے ہیں۔ جب کوئی واقعہ حواس کی فراہم کردہ منطق سے متصادم ہوتا ہے تو عقل فوراً بغاوت پر اتر آتی ہے۔ اس سفر کے دوران پیش آنے والے تینوں واقعات انسانی نفسیات اور عقل کے اسی تضاد کی زندہ تصویر پیش کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ ایک غریب بستی کے ساحل پر پیش آیا جہاں سے ان دونوں ہستیوں نے ایک کشتی پر سوار ہو کر دریا کا سفر شروع کیا۔ کشتی والوں نے ان کی بزرگی کو بھانپتے ہوئے ان سے کرایہ طلب نہیں کیا۔ اس احسان اور حسنِ سلوک کے جواب میں حضرت خضر نے ایک ایسا فعل انجام دیا جو ظاہری طور پر سراسر احسان فراموشی اور تخریب کاری پر مبنی تھا۔

قرآنِ مجید اس واقعے کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

﴿فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا﴾

ترجمہ: "پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو خضر نے اس میں شگاف کر دیا۔ موسیٰ نے کہا کیا آپ نے اس لیے شگاف کیا ہے کہ سواروں کو غرق کر دیں؟ یہ تو آپ نے بہت بری بات کی ہے۔"[24]

حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کے سب سے بڑے امین تھے۔ شریعت کا تقاضا عدل اور ظاہری جان و مال کا تحفظ ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے غریبوں کے واحد معاشی اثاثے کو نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی بشری جبلت اور عدل پر مبنی فطرت نے فوراً آواز اٹھائی۔ ان کا یہ اعتراض بالکل جائز تھا کیونکہ شریعت کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دوسرے کی املاک کو بلاوجہ نقصان پہنچائے۔

سفر کے اختتام پر حضرت خضر نے اس ظاہری تخریب کے پیچھے چھپی ہوئی جو حیرت انگیز تکوینی حکمت بیان کی، وہ معاشیات اور سیاسیات کا ایک عظیم اصول ہے۔ انہوں نے اس سوراخ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرمایا:

﴿أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا﴾

[24] الکہف، 18:71، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ترجمہ: "بات یہ ہے کہ کشتی چند غریبوں کی تھی جو دریا میں محنت کر کے روزی کماتے تھے تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر (بے عیب) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔"[25]

یہاں اسلامی فقہ اور سیاسی معاشیات کا ایک بنیادی قاعدہ "ارتکابِ اخف الضررین" (دو نقصانات میں سے کم تر نقصان کو چن لینا) اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ بادشاہ غریبوں کی وہ کشتیاں چھین رہا تھا جو بالکل درست حالت میں تھیں۔ حضرت خضر نے اس کشتی میں ایک چھوٹا سا عیب پیدا کر کے اسے ظالم بادشاہ کی نظروں میں غیر پرکشش بنا دیا۔ کشتی کا ایک تختہ ٹوٹنے سے ان غریبوں کا تھوڑا سا مالی نقصان تو ہوا، مگر ان کا پورا معاشی اثاثہ چھننے سے بچ گیا۔

مولانا جلال الدین محمد رومی نے اپنی مثنوی میں ظاہری نقصان کے پردے میں چھپی اس باطنی رحمت اور قدرت کے اس پراسرار بچاؤ کو نہایت خوبصورت تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے:

دستِ خضر از تختۂ کشتی شکست
در شکستِ او سفینہ ہا جاں برَست

ترجمہ: "اگر حضرت خضر کے ہاتھ نے کشتی کا تختہ توڑ دیا تھا، تو درحقیقت اس کے توڑنے میں ہی کشتی والوں کی جان اور مال کی سلامتی پوشیدہ تھی۔"[26]

عقل کی حد بندیوں کا یہ پہلا امتحان تھا جو مال اور املاک کے نقصان پر مبنی تھا۔ دوسرا واقعہ اس سے کہیں زیادہ سنگین تھا، جس نے انسانی جذبات اور منطق کی تمام سرحدوں کو عبور کر لیا۔ جب یہ دونوں ہستیاں کشتی سے اتر کر خشکی پر چل رہی تھیں، تو ان کا سامنا ایک کم سن بچے سے ہوا۔ حضرت خضر نے بغیر کسی ظاہری سبب یا جرم کے اس معصوم بچے کی جان لے لی۔

انسانی تاریخ کے اس سخت ترین واقعے اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شدید ردعمل کو قرآنِ مجید یوں نقل کرتا ہے:

﴿فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا﴾

ترجمہ: "پھر دونوں چلے یہاں تک کہ انہیں ایک لڑکا ملا تو خضر نے اسے مار ڈالا۔ موسیٰ نے کہا کیا آپ نے ایک بے گناہ جان کو بغیر کسی جان کے (بدلے کے) ناحق مار ڈالا؟ یہ تو آپ نے بہت ہی بری حرکت کی۔"[27]

یہاں لفظ "نُّكْرًا" کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ یہ فعل پہلے فعل (امراً) سے کہیں زیادہ ناقابلِ برداشت تھا۔ معصوم بچے کا قتل شریعت اور انسانی ہمدردی، دونوں کے نزدیک ایک صریح ظلم ہے۔ جدید دور کے ملحدین اکثر مسئلہ شر کے تحت یہی سوال اٹھاتے ہیں کہ

---

[25] الکہف، 18:79، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[26] رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، دفتر اول، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ، ص:112

[27] الکہف، 18:74، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اگر دنیا کو چلانے والی ذات رحیم و کریم ہے، تو اس دنیا میں معصوم بچوں کو بیماریاں کیوں لگتی ہیں؟ انہیں آفات میں موت کیوں آتی ہے؟ انسانی عقل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا، کیونکہ وہ واقعے کو صرف حال کے آئینے میں دیکھتی ہے، جبکہ منشائے الٰہی مستقبل کی ان دیکھی پرتوں کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔

حضرت خضر نے اس بظاہر ظالمانہ فعل کے پیچھے جو تکوینی علم ظاہر کیا، وہ کائنات میں موجود ہر بظاہر تکلیف دہ واقعے کے لیے ایک ابدی تسکین فراہم کرتا ہے:

﴿وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا * فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا﴾

ترجمہ: "اور جو لڑکا تھا اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بڑا ہو کر اپنی سرکشی اور کفر سے انہیں بھی تنگ کرے گا۔ تو ہم نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس کے بدلے ihnen اور بچہ عطا فرمائے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور شفقت میں بھی قریب تر ہو۔" [28]

اس واقعے میں انسانی جسم کی عارضی زندگی اور روح کی ابدی سلامتی کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ بچے کا جسمانی طور پر مر جانا بلاشبہ ایک المیہ تھا، مگر اس کے زندہ رہنے کی صورت میں والدین کا کفر اور سرکشی میں مبتلا ہو جانا اس سے کہیں بڑا روحانی المیہ تھا۔ قدرتِ خداوندی نے والدین کے ایمان کو بچانے کے لیے اس بچے کی جسمانی موت کا فیصلہ صادر کیا۔

معروف برطانوی فلسفی اور ماہرِ الٰہیات رچرڈ سوئن برن نے کائنات میں موجود تکالیف اور مسئلہ شر پر بحث کرتے ہوئے انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا جو معیار پیش کیا ہے، وہ اس قرآنی حکمت کی عین تائید کرتا ہے:

"The value of human life is not to be measured by its length, but by its spiritual quality and the eternal consequences of our moral choices".

ترجمہ: "انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو اس کی طوالت سے نہیں ناپا جا سکتا، بلکہ اس کا تعین اس کی روحانی پاکیزگی اور ہمارے اخلاقی فیصلوں کے ابدی نتائج سے ہوتا ہے۔" [29]

دنیا میں ہونے والے سانحات دراصل خالقِ کائنات کی طرف سے کوئی اندھا ظلم نہیں ہوتے، بلکہ وہ ایک ایسی وسیع تر حکمتِ عملی کا حصہ ہوتے ہیں جس کا علم انسان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کائناتی حقیقت کو حافظ شیرازی نے اپنے مخصوص صوفیانہ لہجے میں کیا خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

در طریقت ہر چہ پیشِ سالک آید خیرِ اوست

---

[28] الکہف، 18:80-81، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[29] Swinburne, Richard, Providence and the Problem of Evil, Oxford: Oxford University Press, 1998, p. 145

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

در صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

ترجمہ: "طریقت کے اس سفر میں سالک کے سامنے جو بھی سانحہ یا واقعہ پیش آتا ہے اس میں اسی کی بھلائی چھپی ہوتی ہے، اے دل تو یہ یاد رکھ کہ سیدھے راستے پر چلنے والا کبھی گمراہ (نقصان میں) نہیں ہو سکتا۔"[30]

پہلے واقعے میں مال کا امتحان تھا، دوسرے میں جان کا، اور اب تیسرا واقعہ انسانی اخلاقیات، معاشرتی رویوں اور انا کا امتحان تھا۔ دونوں ہستیاں مسلسل سفر کی وجہ سے تھکاوٹ اور بھوک کا شکار تھیں۔ وہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے ضیافت طلب کی، مگر بستی والوں نے انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کھانا دینے سے انکار کر دیا۔

اس اخلاقی گراوٹ اور معاشرتی بے حسی کے ماحول میں حضرت خضر نے ایک بار پھر انسانی منطق کو حیران کر دینے والا عمل کیا:

﴿فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ ۖ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا﴾

ترجمہ: "پھر دونوں چلے یہاں تک کہ ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے اور ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان کی ضیافت کرنے سے انکار کر دیا پھر انہوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی تو خضر نے اسے سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کام کی مزدوری لے سکتے تھے۔"[31]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق بالکل بجا تھی۔ جب بستی والوں نے مسافروں کو ایک لقمہ تک دینے سے انکار کر دیا، تو ان کے گرتے ہوئے مکانات کی مفت میں تعمیر و مرمت کرنا انسانی خودداری کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔ شریعت بھی محنت کا صلہ مانگنے کا حق دیتی ہے۔ مگر تکوینی علوم کی دنیا میں فیصلوں کا دارومدار حال کے اعمال پر نہیں، بلکہ ماضی اور مستقبل میں چھپی ہوئی نیکیوں کے تسلسل پر ہوتا ہے۔

حضرت خضر نے اس بغیر اجرت کی جانے والی مشقت کا جو باطنی راز افشا کیا، وہ سماجیات اور اعمال کی ابدی منتقلی کا ایک روشن باب ہے:

﴿وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ﴾

ترجمہ: "اور دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کے لیے ایک خزانہ مدفون تھا اور ان کا باپ ایک نیک انسان تھا تو آپ کے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، یہ آپ کے پروردگار کی رحمت تھی۔"[32]

---

[30] حافظ، شمس الدین محمد، دیوانِ حافظ، تہران: انتشاراتِ نگاہ، 1380ھ، ص:120

[31] الکہف، 18:77، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

یہاں کائنات کا وہ غیبی اور خاموش نظامِ عدل کام کر رہا تھا جس میں ایک نیک باپ کی دیانت داری اور نیکیوں کا صلہ اس کی موت کے بعد اس کی یتیم اولاد کو دیا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نیک باپ کے اثاثے کو اس لالچی اور بے حس بستی والوں سے بچانے کے لیے وقت کے ایک جلیل القدر پیغمبر اور تکوینی نظام کے نگران کو ایک مزدور کی حیثیت سے بھیج دیا۔

امام ابنِ قیم الجوزیہ معاشرے میں نیکیوں کے اس تسلسل اور اللہ کی مخفی مدد کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ انسان جب کوئی نیکی محض اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی اولاد اور آنے والی نسلوں کا محافظ بن جاتا ہے، یہاں تک کہ اجنبی لوگوں کے دلوں میں ان یتیموں کی مدد کا داعیہ پیدا کر دیا جاتا ہے[33]۔

حضرت شیخ سعدی شیرازی نے نیکی کے اسی کائناتی قانون اور بے لوث خدمت کے فلسفے کو اپنے اس امر شعر میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے:

تو نیکی می کُن و در دجلہ انداز

کہ ایزد در بیابانت دہد باز

ترجمہ: "تو نیکی کر اور اسے دریا میں ڈال دے (یعنی صلے کی پرواہ کیے بغیر بھول جا)، کہ اللہ تجھے تیری اس نیکی کا صلہ اس وقت دے گا جب تو کسی سنسان بیابان میں تنہا ہو گا۔"[34]

ان تینوں واقعات کے اختتام پر حضرت خضر نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ یہ تمام بظاہر حیرت انگیز اور متضاد افعال انہوں نے اپنے کسی ذاتی علم یا ارادے سے نہیں کیے تھے۔ انہوں نے کائنات کو کنٹرول کرنے والی اس عظیم ذات کی حاکمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

﴿وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾

ترجمہ: "اور یہ کام میں نے اپنے ارادے سے نہیں کیے، یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔"[35]

یہ اختتامی اعلان انسانی عقل کو یہ سبق دیتا ہے کہ جب وہ کائنات کے پراسرار اور تکلیف دہ واقعات کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیتی ہے، تو اسے وہ قلبی اور نفسیاتی سکون حاصل ہو جاتا ہے جو علمِ ظاہر کے تمام دفتر چھاننے کے بعد بھی نہیں ملتا۔ عقل کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کائنات کا نظام ایک ایسی قادرِ مطلق ذات کے ہاتھ میں ہے جس کا ہر فعل حکمت، رحمت اور ابدی انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

---

[32] الکہف، 18:82، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[33] ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، بیروت: دار الکتب العربی، 1996ء، ج:2، ص:254

[34] سعدی، مصلح الدین، مواعظ سعدی، تہران: انتشاراتِ علمی، 1990ء، ص:45

[35] الکہف، 18:82، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مسئلہ شر کا جواب

انسانی تاریخ میں جب بھی فلسفے اور علمِ کلام کی محفلیں سجی ہیں، ایک سوال نے انسانی عقل کو سب سے زیادہ الجھائے رکھا ہے، اور وہ کائنات میں موجود دکھ، تکلیف اور بظاہر ہونے والے ظلم کا وجود ہے۔ جدید دور کا الحاد خدا کی ہستی کا انکار کرنے کے لیے سب سے بڑا ہتھیار اسی "مسئلہ شر" کو بناتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ اگر کائنات کا خالق رحیم و کریم اور قادرِ مطلق ہے، تو دنیا میں معصوم بچوں کو بیماریاں کیوں لگتی ہیں؟ قدرتی آفات غریبوں کی بستیوں کو کیوں اجاڑ دیتی ہیں؟

اٹھارویں صدی کے معروف سکاٹش فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے ملحدین کے اس بنیادی اعتراض اور فلسفیانہ الجھن کو اپنے مشہور مکالمات میں انتہائی دوٹوک انداز میں یوں پیش کیا ہے:

"Is he willing to prevent evil, but not able? Then is he impotent. Is he able, but not willing? Then is he malevolent. Is he both able and willing? Whence then is evil"?

ترجمہ: "کیا وہ (خدا) برائی کو روکنا چاہتا ہے لیکن طاقت نہیں رکھتا؟ تو پھر وہ کمزور ہے۔ کیا وہ طاقت رکھتا ہے لیکن روکنا نہیں چاہتا؟ تو پھر وہ بدخواہ ہے۔ کیا وہ طاقت بھی رکھتا ہے اور چاہتا بھی ہے؟ تو پھر یہ برائی کہاں سے آئی؟"[36]

ملحدین کا یہ اعتراض ظاہری اسباب اور انسانی منطق کے دائرے میں بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو شریعت اور ظاہری عدل کے پیامبر تھے، ان کا حضرت خضر علیہ السلام کے افعال (کشتی توڑنے اور معصوم بچے کو قتل کرنے) پر تڑپ اٹھنا اسی انسانی فطرت اور ظاہری منطق کی آواز تھی۔ مگر سورہ کہف کا یہ عظیم واقعہ اس فلسفیانہ الجھن کا وہ حتمی اور کائناتی جواب فراہم کرتا ہے جو عقل کی تمام گرہیں کھول دیتا ہے۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ انسان کا علم زمان و مکان کی ایک انتہائی محدود قید میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان کسی بھی واقعے کو صرف اس کے "حال" کے آئینے میں دیکھتا ہے، جبکہ منشائے الٰہی اس واقعے کے ماضی، حال اور مستقبل کی ان دیکھی پرتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ حضرت خضر کا بچے کو قتل کرنا بظاہر خالص شر نظر آتا تھا، لیکن قدرتِ خداوندی کے وسیع تر کینوس پر وہ ایک بہت بڑی روحانی تباہی کو روکنے کا واحد ذریعہ تھا۔ والدین کے ایمان کا چھن جانا اور ان کا کفر میں مبتلا ہو جانا اس جسمانی موت سے کہیں بڑا المیہ تھا۔

مولانا جلال الدین محمد رومی نے اپنی مثنوی میں اس مادی منطق کے دھوکے اور کائنات میں شر کے نسبتی ہونے کو ایک کائناتی اصول کے طور پر اس طرح بیان کیا ہے:

پس بدِ مطلق نباشد در جہاں

[36] Hume, David, Dialogues Concerning Natural Religion, London: Penguin Books, 1990, p. 108

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

بد بہ نسبت باشد ایں راہم بداں

ترجمہ: "پس اس دنیا میں کوئی بھی برائی یا شر مطلق نہیں ہے، یہ جان لو کہ برائی ہمیشہ نسبتی ہوتی ہے۔"[37]

رومی کے اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز ایک زاویے سے سانحہ اور شر معلوم ہو رہی ہوتی ہے، وہی چیز کائنات کے مجموعی نظام اور وسیع تر الٰہی حکمت کے زاویے سے خیر کا باعث ہوتی ہے۔ کشتی کا ٹوٹنا غریبوں کے لیے اس وقت ایک شر تھا، مگر مستقبل کے ظالم بادشاہ سے بچاؤ کے تناظر میں وہ خالص خیر تھی۔

قرآنِ مجید نے انسانی عقل کی اس کوتاہی اور قدرتِ خداوندی کے اس مخفی نظامِ خیر کو ایک اور مقام پر ایک آفاقی قاعدے کے طور پر بیان فرمایا ہے:

﴿وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

ترجمہ: "اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو، اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"[38]

علامہ ابنِ قیم الجوزیہ اس قرآنی فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندے پر کوئی ایسا دکھ یا سانحہ مسلط نہیں کرتا جس میں بندے کے لیے کوئی بھلائی نہ چھپی ہو۔ یہ انسانی عقل کا قصور ہے کہ وہ کڑوی دوا کو ظلم سمجھ بیٹھتی ہے، حالانکہ وہ شفیق طبیب کی طرف سے دی گئی شفا ہوتی ہے[39]۔

جدید الحاد کا المیہ یہ ہے کہ وہ کائنات کو ایک بے مقصد اور اندھی مشین سمجھتا ہے، اس لیے اسے ہر تکلیف دہ چیز میں ظلم نظر آتا ہے۔ جب انسان کائنات کے ان بظاہر متضاد افعال کے پیچھے چھپی ہوئی قدرتِ خداوندی کی شفیق حکمت کو جان لیتا ہے تو اس کے اندر سے کائنات کا شکوہ اور خدا سے بغاوت کا مادہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

مشیتِ الٰہی پر یقین اور تسلیم و رضا کے اثرات

کائنات کے پوشیدہ حقائق اور مسئلہ شر کے اس عقدے کو حل کر لینے کے بعد، اس واقعے کا سب سے گہرا اثر انسانی نفسیات اور انسانی معاشرے کے رویوں پر مرتب ہوتا ہے۔ جدید دور کا انسان بے تحاشا سائنسی اور معاشی ترقی کے باوجود شدید قسم کی ذہنی الجھنوں، ڈپریشن اور وجودی اضطراب کا شکار ہے۔ اس اضطراب کی سب سے بڑی وجہ انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے مستقبل اور ارد گرد کے حالات کو مکمل طور پر کنٹرول کر لے۔ جب حالات اس کی منطق اور مرضی کے خلاف جاتے ہیں، تو اس کے اعصاب ٹوٹنے لگتے ہیں۔

---

[37] رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، دفتر چہارم، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ، ص:312

[38] البقرہ، 2:216، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

[39] ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، بیروت: دار الکتب العربی، 1996ء، ج:2، ص:218

مجمع البحرین کے اس سفر نے ثابت کیا کہ انسان حالات کا حقیقی کنٹرولر نہیں ہے۔ جو چیزیں بظاہر انسان کے خلاف جارہی ہوتی ہیں، وہ دراصل ایک مہربان اور قادرِ مطلق ذات کی طرف سے ترتیب دی گئی کسی عظیم تر بھلائی کا حصہ ہوتی ہیں۔ معروف آسٹروی ماہرِ نفسیات وکٹر فرینکل، جنہوں نے ہولوکاسٹ کے عقوبت خانوں میں انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا، اپنی کتاب میں معنی اور دکھ کے تعلق کو یوں واضح کرتے ہیں:

"In some ways suffering ceases to be suffering at the moment it finds a meaning".

ترجمہ: "کئی اعتبار سے، دکھ اس لمحے دکھ نہیں رہتا جب اسے کوئی معنی مل جاتا ہے۔"[40]

یہاں فرینکل اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو مشیتِ الٰہی پر کامل یقین کے بعد ایک مومن کو حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک مسلمان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی کشتی کا ٹوٹنا یا اس کا کوئی شدید مالی و جانی نقصان رائیگاں نہیں ہے، بلکہ اس کے خالق کی کسی عظیم حکمت کا حصہ ہے، تو اس کا دکھ ایک باطنی سکون میں بدل جاتا ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے رضائے باری تعالیٰ پر راضی رہنے والے مومن کی اس نفسیاتی معراج اور عمرانی رویے کو انتہائی حیرت اور مسرت کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ﴾

ترجمہ: "مومن کا معاملہ بھی خوب ہے، اس کے ہر کام میں اس کے لیے بھلائی ہے۔ اور یہ بات مومن کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے، یہ اس کے لیے بھلائی ہے، اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے لیے بھلائی ہے۔"[41]

اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں "تسلیم و رضا" (خدا کے فیصلوں پر راضی رہنا) انسان کی تمام نفسیاتی الجھنوں کا حتمی علاج ہے۔ اس کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا یا عمل ترک کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ کوشش کرے، مگر نتائج کو اپنی مرضی کے تابع سمجھنے کی بیماری سے نکل کر قدرتِ خداوندی کے سپرد کر دے۔

خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں کائنات کے اس کڑے نظام کے سامنے انسانی ارادے کی حد بندی اور تسلیم و رضا کے رویے کو اس طرح پیش کیا ہے:

رضا بہ دادہ بدہ وز جبین گرہ بکشای
کہ بر من و تو درِ اختیار نگشادہ است

---

[40] Frankl, Viktor E., Man's Search for Meaning, Boston: Beacon Press, 2006, p. 113

[41] مسلم، مسلم بن الحجاج، الصحیح، کتاب الزہد والرقائق، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1991ء، حدیث نمبر: 2999، ج: 4، ص: 2295

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ترجمہ: "جو کچھ تجھے عطا کیا گیا ہے اس پر راضی ہو جا اور اپنے ماتھے سے شکن دور کر لے، کیونکہ میرے اور تیرے لیے مکمل اختیار کا دروازہ نہیں کھولا گیا۔"[42]

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی اس ملاقات کا عمرانی پہلو یہ ہے کہ جو معاشرہ مشیتِ الٰہی پر بھروسہ (توکل) کرنے والے افراد پر مشتمل ہوتا ہے، وہاں کی دوڑ، حسد، انتقام اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت پرستی ختم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو یہ شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ گرتی ہوئی دیوار کو بغیر اجرت کے سیدھا کر دینا بے وقوفی نہیں، بلکہ کائنات کے اس خفیہ اور عادلانہ نظام میں ایک مستقل سرمایہ کاری ہے۔ کائنات میں بظاہر نظر آنے والا انتشار دراصل ایک گہری اور آفاقی ترتیب کا حصہ ہے، جس کی باگ ڈور اس علیم و خبیر ذات کے ہاتھ میں ہے جو ٹوٹتی ہوئی کشتیوں اور یتیموں کی گرتی ہوئی دیواروں کا اصل محافظ ہے۔

جبر و قدر کی بحث اور انسانی عمل کا دائرہ کار

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے اس طویل اور پر اسرار واقعے کا مطالعہ کرتے ہوئے انسانی ذہن میں ایک انتہائی نازک فکری اور فقہی الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کائنات کا ہر ظاہری نقصان، قدرتی آفت اور تکلیف کسی پوشیدہ الٰہی حکمت کا حصہ ہے، تو کیا انسان کو برائی اور ظلم کے خلاف اپنی جدوجہد ترک کر دینی چاہیے؟ کیا ایک انسان محض یہ سوچ کر ظالم کو کھلی چھوٹ دے سکتا ہے کہ شاید اس ظلم کے پیچھے قدرتِ خداوندی کا کوئی خفیہ اور تکوینی منصوبہ کارفرما ہو؟ اس مقام پر آ کر علمِ ظاہر (شریعت) اور علمِ باطن (تکوین) کی سرحدیں اور ان کا باہمی توازن سمجھنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے، ورنہ انسانی معاشرہ شدید فکری انحراف کا شکار ہو سکتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسان کی دنیاوی زندگی اور اس کے معاشرتی رویوں کے لیے علمِ باطن کو نہیں بلکہ علمِ ظاہر اور شریعتِ مطہرہ کو حتمی کسوٹی قرار دیا ہے۔ قدرت نے انسان کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ غیب کے پردوں میں جھانک کر فیصلے کرے، بلکہ اسے واضح احکامات کا پابند کیا ہے۔

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾

ترجمہ: "اور جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔"[43]

اس واقعے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتراض کرنا ان کی کوئی کمزوری نہیں تھی، بلکہ وہ شریعت کے عظیم ترین امین ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ ان کا ردعمل عین انسانی فطرت اور شریعت کے مطابق تھا، کیونکہ شریعت ظاہری اسباب اور عدل پر مبنی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا دائرہ کار ایک استثنائی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے افعال عام انسانوں کے لیے کوئی قابلِ تقلید شرعی نمونہ نہیں ہیں، بلکہ وہ منشائے الٰہی کے براہِ راست نفاذ کا ایک خاص اور محدود واقعہ تھا۔

---

[42] حافظ، شمس الدین محمد، دیوانِ حافظ، تہران: انتشاراتِ نگاہ، 1380ھ، ص:245

[43] الحشر، 59:7، ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ نے اس فکری الجھن پر انتہائی سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے ان باطنی اور گمراہ فرقوں کا سختی سے رد کیا ہے جو شریعت کی پابندی کو ترک کر کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں حضرت خضر کی طرح براہِ راست علمِ الٰہی حاصل ہو گیا ہے۔ وہ اس رویے کو صریح گمراہی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی لائی ہوئی شریعت سے اسی طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہے جس طرح خضر موسیٰ کی شریعت سے مستثنیٰ تھے، تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے[44]۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے بھی دنیاوی معاملات اور عدالتی فیصلوں میں ظاہری حقائق کو ہی بنیاد بنانے کا حکم دیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے علمِ غیب رکھنے کے باوجود قاضی اور منصف کی حیثیت سے ظاہری شواہد کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِيَ لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ﴾

ترجمہ: "میں تو محض ایک انسان ہوں، اور تم میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی نسبت اپنی دلیل پیش کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو، تو میں جو کچھ سنتا ہوں اسی کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں۔"[45]

اس واقعے کی غلط تفہیم انسان کو ایک اور سنگین فلسفیانہ بیماری میں مبتلا کر سکتی ہے جسے "جبر" کہا جاتا ہے۔ جب انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ کائناتی اسکرپٹ کے تحت ہو رہا ہے، تو وہ عمل اور جدوجہد کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ناکامیوں اور پسپائی کو تقدیر کا نام دے کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ رویہ انسانی معاشرے کی ترقی کو مکمل طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔

معروف فرانسیسی فلسفی اور وجودیت کے بانی ژاں پال سارتر نے انسان کی عملی ذمہ داریوں سے اس فرار پر کڑی تنقید کی ہے۔ اگرچہ اس کا فلسفہ الحادی بنیادوں پر قائم ہے، مگر انسانی عمل اور انتخاب کے حوالے سے اس کا یہ تجزیہ انسان کے کندھوں پر موجود ذمہ داری کے بوجھ کو واضح کرتا ہے:

"Man is condemned to be free; because once thrown into the world, he is responsible for everything he does".

ترجمہ: "انسان آزاد ہونے کے لیے مجبور (محکوم) ہے؛ کیونکہ جب اسے ایک بار اس دنیا میں پھینک دیا گیا، تو اب وہ اپنے ہر فعل کا خود ذمہ دار ہے۔"[46]

---

[44] ابن تیمیہ، تقی الدین، مجموع الفتاوی، ریاض: دار عالم الکتب، 1991ء، ج:11، ص:420

[45] البخاری، محمد بن اسماعیل، الصحیح، کتاب المظالم والغصب، بیروت: دار طوق النجاۃ، 1422ھ، حدیث نمبر:2458، ج:3، ص:129

[46] Sartre, Jean-Paul, Being and Nothingness, translated by Hazel E. Barnes, New York: Washington Square Press, 1992, p. 553

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اسلامی فریم ورک میں یہ آزادی مطلق نہیں ہے، بلکہ یہ توکل اور عمل کے ایک انتہائی خوبصورت اور متوازن امتزاج کا نام ہے۔ انسان اس بات کا پابند ہے کہ وہ اسباب کی دنیا میں رہتے ہوئے برائی کو روکنے، علم حاصل کرنے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی پوری عملی اور فکری قوت صرف کر دے۔ جب وہ اپنے تمام تر مادی اسباب بروئے کار لے آئے، تب اسے نتائج کو اس غیبی اور تکوینی نظام کے سپرد کرنا چاہیے جو حضرت خضر کے پاس تھا۔

مولانا جلال الدین محمد رومی نے جبر و قدر کے اس پیچیدہ فلسفے اور عمل و توکل کے باہمی توازن کو ایک مشہور حدیث کی روشنی میں نہایت سادگی سے حل کیا ہے۔ وہ انسان کی عملی ذمہ داری (اونٹ کا گھٹنا باندھنے) کو تقدیر پر توکل سے متصادم نہیں سمجھتے:

گفت پیغمبر بہ آوازِ بلند
باتوکل زانوئے اشتر ببند
رمز الکاسب حبیب اللہ شنو
از توکل در سبب کاہل مشو

ترجمہ: "پیغمبر نے بلند آواز سے فرمایا کہ توکل بھی کر اور اپنے اونٹ کا گھٹنا بھی باندھ۔ 'محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے' کا راز سن اور سمجھ، اور توکل کی آڑ لے کر اسباب اختیار کرنے میں سستی مت کر۔"[47]

حضرت خضر کے افعال کا اصل مقصد انسان کو عمل سے روکنا نہیں تھا، بلکہ اس کے عمل کے بعد پیدا ہونے والے تکبر کو توڑنا اور ناموافق حالات میں اسے مایوسی سے بچانا تھا۔ جب انسان اپنے حصے کی محنت کر لیتا ہے اور پھر بھی اس کی کشتی ٹوٹ جاتی ہے، تو وہ اس واقعے کی روشنی میں یہ جان لیتا ہے کہ اس ظاہری نقصان میں میرے رب کی کوئی رحمت پوشیدہ ہے۔

علامہ محمد اقبال نے مسلمان نوجوانوں کے اندر اسی فکری اعتدال کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تقدیر کے نام پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور جبر کے اس فلسفے کو مسترد کرتے ہیں جو انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو کھا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بندۂ مومن خود منشائے الٰہی کا بازو بن جاتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے[48]

یہ بحث اس حقیقت کو مکمل طور پر آشکار کر دیتی ہے کہ علمِ شریعت اور علمِ تکوین آپس میں متصادم نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی کائناتی نظام کے دو مختلف رخ ہیں۔ شریعت انسان کا دائرہ عمل طے کرتی ہے، جبکہ تکوین اللہ کی اس پوشیدہ حکمت کا نام ہے جو انسان کے

---

[47] رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، دفتر اول، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ، ص:48

[48] اقبال، محمد، بالِ جبریل (کلیاتِ اقبال)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2005ء، ص:345

دائرہ عمل سے باہر ہونے والے واقعات کی ترتیب بناتی ہے۔ جب انسان ان دونوں کے مابین اپنے حدودِ کار کو پہچان لیتا ہے، تو وہ بیک وقت ایک انتہائی فعال اور باطنی طور پر انتہائی پر سکون وجود بن کر ابھرتا ہے۔

نتائجِ بحث

زیرِ نظر تحقیقی مطالعے کے تجزیاتی مباحث کا عمیق جائزہ لینے کے بعد، اس تحقیق کے حتمی نتائج روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آئے ہیں، جنہیں درج ذیل نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

۱۔ انسانی عقل اور منطق کی رسائی صرف ظاہری اسباب تک محدود ہے، جبکہ کائنات کا حقیقی نظام تکوینی حقائق اور پوشیدہ منشائے الٰہی کے تابع ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا سفر ثابت کرتا ہے کہ علمِ ظاہر اور علمِ باطن کا باہمی امتزاج ہی کائنات کی مکمل حقیقت کو سمجھنے کی کلید ہے۔

۳۔ حصولِ علم کے لیے طالبِ علم کا اپنے استاد کے سامنے قلبی انکساری اور عاجزی اختیار کرنا قرآنی نظامِ تعلیم کی اولین اور بنیادی شرط ہے۔

۴۔ دنیا میں پیش آنے والے بظاہر تکلیف دہ سانحات اور نقصانات کسی اندھے جبر کا نتیجہ نہیں، بلکہ الٰہی حکمت اور وسیع تر کائناتی خیر کا حصہ ہیں۔

۵۔ علمِ تکوین کے پوشیدہ حقائق انسان کو عملی جدوجہد سے نہیں روکتے، بلکہ شریعت انسان کو ظاہری اسباب کے تحت بھرپور عمل کا پابند بناتی ہے۔

۶۔ مشیتِ الٰہی پر کامل یقین اور نامعلوم پر صبر اختیار کرنا ہی دورِ حاضر کے انسان کی نفسیاتی الجھنوں اور وجودی اضطراب کا حتمی علاج ہے۔

سفارشات و تجاویز

اس تحقیقی مطالعے کے نتائج اور عصری تقاضوں کی روشنی میں معاشرے، پالیسی سازوں اور تعلیمی اداروں کے لیے درج ذیل عملی اور علمی سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ تعلیمی اداروں کے نصاب میں انسانی عقل کی محدودیت اور مشیتِ الٰہی کے قرآنی تصور کو شامل کیا جائے تاکہ طلبہ میں فکری اعتدال پیدا ہو۔

۲۔ جدید الحادی اعتراضات بالخصوص 'مسئلہ شر' کا علمی جواب دینے کے لیے جامعات میں سورہ کہف کی تکوینی حکمتوں پر باقاعدہ فکری نشستیں منعقد کی جائیں۔

۳۔ تعلیمی نظام میں تجارتی رویوں کے بجائے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعے سے ماخوذ استاد اور شاگرد کے قلبی و اخلاقی آداب کو رواج دیا جائے۔

۴۔ نوجوان نسل کو ڈپریشن اور مایوسی سے بچانے کے لیے نفسیاتی کونسلنگ سینٹرز میں تسلیم و رضا اور توکل کے اسلامی تصورات کو متعارف کروایا جائے۔

۵۔ منبر و محراب کے ذریعے عوام کو جبر و قدر کے پیچیدہ فلسفے اور شریعت کی عملی پابندی کے مابین درست توازن کا شعور فراہم کیا جائے۔

۶۔ اسلامی اور مغربی فلسفے کے تقابلی مطالعے کو فروغ دینے کے لیے محققین کو جدید سائنسی اور قرآنی علمیات پر مزید تحقیق کی ترغیب دی جائے۔

مصادر و مراجع

- القرآن الکریم۔
- الآلوسی، شہاب الدین، **روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم**، بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1415ھ۔
- ابن تیمیہ، تقی الدین، **مجموع الفتاوی**، ریاض: دار عالم الکتب، 1991ء۔
- ابن کثیر، عماد الدین، **تفسیر القرآن العظیم**، ریاض: دار طیبہ، 1999ء۔
- ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین، **مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین**، بیروت: دار الکتب العربی، 1996ء۔
- اقبال، محمد، **بالِ جبریل (کلیاتِ اقبال)**، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2005ء۔
- البخاری، محمد بن اسماعیل، **الصحیح**، بیروت: دار طوق النجاۃ، 1422ھ۔
- البغوی، ابو محمد، **معالم التنزیل فی تفسیر القرآن**، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1420ھ۔
- حافظ، شمس الدین محمد، **دیوانِ حافظ**، تہران: انتشاراتِ نگاہ، 1380ھ۔
- الرازی، فخر الدین، **مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)**، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1420ھ۔
- رومی، جلال الدین محمد، **مثنوی معنوی**، تہران: مطبع کارخانہ تجارِ کتب، 1373ھ۔
- سعدی، مصلح الدین، **گلستانِ سعدی**، تہران: انتشاراتِ قفنوس، 1998ء۔
- سعدی، مصلح الدین، **مواعظ سعدی**، تہران: انتشاراتِ علمی، 1990ء۔
- الطبری، ابن جریر، **جامع البیان فی تاویل القرآن**، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 2000ء۔

- الغزالی، ابو حامد، **احیاء علوم الدین**، بیروت: دار المعرفہ، 1982ء۔
- غالب، اسد اللہ خان، **دیوانِ غالب**، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 2008ء۔
- القرطبی، ابو عبد اللہ، **الجامع لاحکام القرآن**، قاہرہ: دار الکتب المصریہ، 1964ء۔
- مسلم، مسلم بن الحجاج، **الصحیح**، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1991ء۔
- Frankl, Viktor E., *Man's Search for Meaning*, Boston: Beacon Press, 2006.
- Hayek, Friedrich, *The Pretence of Knowledge*, Stockholm: Nobel Memorial Lecture, 1974.
- Hume, David, *Dialogues Concerning Natural Religion*, London: Penguin Books, 1990.
- Kant, Immanuel, *Critique of Pure Reason*, London: Macmillan, 1929.
- Pascal, Blaise, *Pensées*, New York: Penguin Classics, 1995.
- Sartre, Jean-Paul, *Being and Nothingness*, New York: Washington Square Press, 1992.
- Swinburne, Richard, *Providence and the Problem of Evil*, Oxford: Oxford University Press, 1998.